علی گڑھ ڈائسپورہ - ۱۱

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے فِنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

حسرت موہانی : سید کا شاگرد رشید

پہلی بار انگریزی سرکار کی جیل کے دروازے دو جیالوں کے لئے وا ہوئے تھے، ایک کا نام تھا بال گنگا دھر تلک ۔ اور ۔ دوسرا تھا علی گڑھ کا جیالا حسرت موہانی

ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین) نے حسرت کے بارے میں چند سطریں لکھی تھیں،

شاید ہماری، پیشِ نظر تحریر کی تقریظ کے طور پر!

شاید حسرت کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ذاکر صاحب سے بہتر کوئی لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

کیسی جاندار اور دل آویز تحریر ہے، جس سے مجھے اپنی تحریر کا آغاز کرنا مجھے مناسب لگا:

حسرت بڑی مستحکم طبیعت کے آدمی تھے۔
جس بات کو صحیح جانتے تھے اس کی پیروی میں،
اور دوسروں تک اسے پہنچانے میں،
نہ کسی شخص سے ڈرتے تھے اور نہ کسی چیز سے؛
شاید خود اپنے سے بھی نہیں۔
نفس کے مطالبات کے پیچھے لوگ کیا کچھ نہیں کر ڈالتے؛
حسرت نے ضمیر کے مطالبات کی خاطر سب کچھ کر ڈالا۔
تمام عمر مصیبت جھیلی لیکن
کوئی مصیبت ان کے ضمیر کی آواز کو نہ دبا سکی؛
ہر مصیبت نے ان کی شان دوبالا کی۔
وہ کتنے پکے مسلمان تھے،
کتنے بہادر ہندوستانی،
کیسے سچے آدمی
اور
کیسے اچھے شاعر!
شیریں و شائستہ!

ذاکر صاحب نے حسرت کے بارے میں نثر میں جو مندرجہ بالا شعر کہے ہیں، حسرت کے کردار کی اتنی ہی خوبصورت تصویر کشی، سوداؔ نے اپنے ایک شعر میں کر دی ہے:

سوداؔ قمارِ عشق میں مجنوں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو کھو سکا

'**سر تو کھو سکا**' ڈھائی تین سو سال بعد بھی، حسرت کو سامنے رکھ کر، آپ سے داد طلب ہے۔

☆

غالب، نظیر، حالی اور اقبال کے ساتھ ایک ہی سانس میں اگر میں حسرت کا نام بھی لے دوں تو آپ میں سے بہت سے ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا دعویٰ کر دیں گے! **لیکن** اگر ان چار بڑوں کے ساتھ میں ایک غزل گو کا نام لوں جو اردو کے پہلے بڑے انگریز دشمن، انقلابی سیاسی ماہنامے کا ایڈیٹر تھا، جس نے ان گنت گمنام شعراء کو دریافت کیا، اساتذہ کے کلام کو محفوظ کیا، شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام کی تنقید کی نئی طرح ڈالی، خالص عشقیہ شاعری کی حد تک اردو غزل کو نیا جنم دیا جس میں تہذیب عاشقی بھی تھی، تہذیبِ فن بھی، اس صدی کی ابتدا میں جس نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا، دیس کی آزادی کی جدو جہد کے جرم میں، بال گنگا دھر تلک کے بعد پہلی بار، جس ہندوستانی دانشور کے لئے جیل کے دروازے وا ہوئے، جو کانگریسی بھی تھا مسلم لیگی بھی، کمیونسٹ بھی، صوفی بھی، جو کانگریس کے بچپن سے اس کے قائدوں میں تھا، اور جس نے پہلی بار کانگریس کے پلیٹ فارم سے دیس کی مکمل آزادی کا ریزولوشن اس وقت پیش کیا تھا جب گاندھی جی بھی اپنے آپ کو اس کی تائید کے لئے تیار نہ پا سکے تھے، اور جو اپنا سب کچھ تج کر دیس کی آزادی کے لئے جدو جہد کرتا رہا، اور جب خدمات کے کیش کرانے کا وقت آیا تو وہ چپکے سے کانگریس کے مخالف کیمپ میں پہنچ گیا۔ ایک مسلم لیگی کی حیثیت سے، مگر اپنی مرضی کے خلاف، اس نے **پاکستان** بنتے دیکھا اور خود پوری شانِ بے نیازی سے **ہندوستانی** پارلیمان میں داخل ہو گیا۔ جناح اور گاندھی، نہرو اور لیاقت علی خاں، عبدالباری فرنگی محلی اور آزاد سبحانی، ابو الکلام اور محمد علی اور سب سے بڑھ کر کعبہ اور بردابن کا بیک وقت پیرو بھی اور ان سے باغی بھی۔ اس کی پیروی میں بھی بڑا اپن تھا اور بغاوت میں بھی پیار! بدن پر معمولی کھدّر کا لباس، پیر میں سادہ چپّل، ہاتھ میں پُرانا جھولا پارلیمانی کاغذات شعر و سخن کی بیاض اور گھر کے لئے سودا سلف کا مشترکہ امین! بچوں کے سے معصوم چہرے پر سوچتی ہوئی پیشانی، جس کی گہری لکیروں میں صدیوں کی اردو تہذیب اور اِدھر آدھی صدی کی قومی تحریک سمٹ آئی تھی۔ اتنا معصوم کہ فرشتوں کو بھی پیار آ جائے اور اس معصومیت میں ایسا شدید **باغیانہ** مزاج جیسے اس کی روح جنم جنم کی پیاسی ہو، پُر خلوص قائد اور بڑا انسان! پتہ نہیں رومیؔ کا شیخ چراغ لے کر کس انسان کی آرزو میں نکلا تھا!

غالب، نظیر، حالی اور اقبال کے ساتھ ایک ہی سانس میں اگر میں حسرت کا نام بھی لے دوں تو شاید آپ بُرا نہ مانیں! حسرتؔ اتنے بڑے شاعر نہیں؛ لیکن شاعری ہی تو سب کچھ نہیں۔ حسرتؔ ان چار بڑوں کے ساتھ ہماری تہذیب کی ایک اہم روایت بن گئے ہیں۔ ہمارے شاعروں سے شاعری چھین لیجئے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتے، حسرت سے شاعری کیا سب اضافیات چھین لیجے اور پھر بھی اتنا کچھ بچ رہے گا جس سے وہ بونوں کے مجمع میں ممتاز نظر آنے لگیں۔ اس صفت میں شریک ہر پھر کے اردو، تہذیب کی پچھلی نسلوں میں یہی چار پانچ نام آتے ہیں جنہیں میں بار بار دہرا رہا ہوں۔

اردو تنقید کی ستم ظریفی اور حسرت کی کیا ہماری کم نصیبی، کہ اس کے اصل کام کو، اس کی شخصیت کو فی الحال معرضِ بحث میں نہ لائیے، کسی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور ضمنی کام، شاعری کے تحلیل و تجزیہ میں ساری ذہانت صرف ہونے لگی: فن شعر پر اس کے مقالات، شعراء کے سوانح کے سلسلے میں اس کی تحقیق و تفتیش، نایاب و نادر مخطوطات اور مطبوعات سے درجنوں شعراء کے انتخابات، سیاستِ قومی پر فاضلانہ بحثیں اور اپنے رسالہ کے ذریعہ مذاقِ شاعری کے ساتھ مذاق قوم پرستی کو عام کرنا، حسرت کا اصل کام یہ تھا۔ شاعری کا فطری ذوق تھا، ہزاروں شعر نظر سے گزرتے رہے، حسرت بھی باقاعدہ شاعر بن گئے اور اردو والوں نے سمجھا کہ حسرت شاعر تھے، اور بس۔

حسرت اچھے شاعر تھے، اور خالص تغزل میں ان کے کچھ **منتخب** شعر مل جاتے ہیں، جنہیں کبھی کبھی گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے شعر اردو کی عشقیہ شاعری میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں۔ حسرتؔ کی معصوم فطرت، ان کی تہذیبِ عاشقی اور ایک رچا ہوا تہذیبی شعور، ان میں جاری و ساری ہے، ایک شریف دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے؛ مگر اس کے آگے کچھ نہیں۔ زندگی اور اس کی کشمکش کو تمام پہلوؤں کے ساتھ انگیز کرنے، سمجھنے کا حوصلہ نہیں ملتا۔ بس اتنا ہے کہ "اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے" اور کہیں محدود سی دنیا بسا کر: بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نشود رز زہد، ہمچو توئے، یا بفسق ہمچو منے! پڑھتا ہوا ہمارا شاعر دیوان کو تمّت تک پہنچا دیتا ہے۔

ایسے لمحات آتے ہیں جب ان کے ایسے اشعار پڑھنے کو

، پڑھتے رہنے کو، جی چاہتا ہے :

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرمِ یار کی پروانہ کریں
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
دل اور تہیّہ ترکِ خیال یار کرے
کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے
سخت محرومِ ادب ہے دل حسرت نے اگر
بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا
ہشیار کہ اس پُرسشِ پیہم کی نوازش
عشّاق ستم کش کو ہوس کا ر نہ کردے
ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کردے
روشِ حُسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
سعیِ تاویل خیالات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پُرسشِ حالات چلی جاتی ہے
نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کانام جنوں پڑگیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

☆

چاروں اُور سے کراہوں کی آوازیں آرہی ہیں! دور سے کوئی چیخ سناٹے کو چیرتی ہوئی آتی ہے:

ع ملالِ عالمیاں دم بدم دگرگوں شد!

ایسے میں، اردو ادیب/شاعر خاموشی سے کیسے گزار سکتا ہے! وہ کیسے کہے: نا بابا نا! ہم بہو بٹیاں یہ کیا جانیں: سیاست سے ہمارا کیا واسطہ، ہم ادیب ٹھہرے، شاعر ٹھہرے۔ شاعر حسرت نے اس کا ایک حل نکال لیا: ع اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی! بیسویں صدی کے پہلے دہے میں ادب میں بے ادبی کی یہ طرح ڈالنے والا پہلا 'بے ادب' ادیب حسرت موہانی تھا۔ ۱۹ویں صدی میں یہ طرح ڈالی تھی حسرت کے مرشد اولیں، علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید نے۔ اور، بیسویں صدی میں، حسرت کے بعد تو اس روش پر چلنے والا ایک پورا قافلہ تیار ہوتا گیا'' سیاسی کروٹ'' والے شبلی، **لسان الصدق** والے ابوالکلام (الہلال سے بہت پہلے)، ہمدرد/ کامریڈ والے محمد علی، زمیندار والے ظفر علی خاں اور انگنت جیالے! حسرت، سرسید کی علی گڑھ تحریک کے زائیدہ تھے، دانشوروں کی اسی لائن میں جس میں حالی، شبلی، ابوالکلام، ذاکر حسین اور سیدین، عابد حسین اور آل احمد سرور تھے: سرسید کی علی گڑھ تحریک کی قیمتی/ باوقار/ مفید انسانیت روایات و اقدار کے امین! وہ اقدار جن میں اختلاف کو سہنا؛ اور متضاد عناصر کو گوارا کرنا ایک اہم قدر تھی۔

سرسید نے صحافت کو اپنے افکار وخیالات کے نشر کا ذریعہ بنایا: سائنٹفک سوسائٹی گزٹ / علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق سرسید کے ذرائع تھے۔ حسرت نے علیگڑھ کالج سے اپنی وابستگی کو جاری رکھتے ہوئے کالج کی بزمِ علم وادب، اردوئے معلّٰی ہی کے نام پر ایک ماہنامہ اردوئے معلّٰی نکالا۔ علیگڑھ تحریک کے زائیدگان کے لئے کوئی در بند نہیں ہوتا۔ پوری زندگی، مکمل زندگی، کو Deal کرنا ہوتا ہے: اب اسے خانوں میں بانٹ کر کیجئے یا سب کچھ سمیٹ کر۔ (عارف ہسوی نے **نظر بندان اسلام** سلسلے میں جو لکھا ہے حسرت نے اپنے اردوئے معلّٰی سے کہ قوم کو جگایا: الہلال کے ابوالکلام نے ۱۳-۱۹۱۲ میں جو کام کیا، عارف ہسوی نے غلط نہیں لکھا کہ حسرت یہ کام صدی کی پہلی دہائی میں انجام دے چکے تھے)۔ حسرت پوری زندگی کو سمیٹ کر چلے، جس میں خلق کے دکھ بھی تھے، اپنا درد بھی۔ انہوں نے دونوں کو خانوں میں بانٹ دیا۔

شاعر تو تھے وہ؛ دل زدہ بھی تھے! اس لئے دل والی شاعری کی، تو اسے آسمانی بلندیوں پر لے گئے۔ دل والی شاعری کی بھی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے لیکن انھوں نے پڑاؤ یہیں ڈال دیا؛ **دل** سے چل کے **دماغ** کی شاعری تک پہنچنے کے جھمیلے میں وہ نہیں پڑے کہ شاید انہیں یہ ملاوٹ منظور نہیں تھی: دونوں خانے ان کے یہاں الگ الگ تھے۔ دیس کی آزادی کے لئے قید وبند کی تکلیفیں سہنا: چکّی پیسنا، گھر کا قیمتی اثاثہ حتیٰ کہ اپنا قیمتی عزیز کتاب خانہ بھی ردّی کے بھاؤ نیلام ہوتے بے بسی سے دیکھتے رہنا: دماغ شاعری میں نہیں غلامی کی زنجیریں توڑنے میں لگا رہا اور، دل چکّی پیستے میں بھی غزل کی نذر ہوتا رہا! پوری زندگی، دل الگ، دماغ الگ! حتّٰی کہ رسالہ (اردوئے معلّٰی) نکالا تو اس میں بھی دو متوازی دھارے چلتے رہے: ایک طرف نکات سخن اور تذکرہ شعرا اور عیوب ومحاسنِ شاعری اور شاعری کے اقسام اور مخطوطات اور مطبوعات سے قدیم اور معاصر شعرا کے کلام کے درجنوں انتخابات؛ اور دوسری طرف سیاستِ قومی کے مباحث اور دلوں میں آگ لگا دینے والی انقلابی تحریریں، جنہیں پڑھ کے لگتا تھا کہ انگریزی حکومت اب گئی اور اب گئی؛ اور یہ بیسیویں صدی کی پہلی دہائی کی باتیں ہیں۔

شاعری ان کا سارا asset نہیں، یہ سچ ہے؛ لیکن شاعری سے ان کا عجیب سا mysterious سا رشتہ ہے، لگ بھگ محبوبہ کا رشتہ، جوان کے لئے سرچشمۂ فیضان (انسپریشن) بنی رہی؛ ساری عمر! دل کی آگ محبوبۂ شاعری کے رخ زیبا سے روشن کرتے تھے، اور اس فیضان سے اپنے اردگرد کی دنیا کو، اپنے بس بھر روشن کرتے رہتے تھے۔

مزاجاً، اور بنیادی طور سے، حسرت شاعر ہی تھے۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے، سوچتے تھے، لکھتے تھے، شخصیت میں شاعر رسا بسا رہتا تھا۔ تصوف ہو، کمیونزم ہو، کانگریس ہو، مسلم لیگ ہو، آزادی کی جنگ ہو: وہ کہیں بھی ہوں، غزل کا شاعر، غزل کا طور، غزل کا فن ان پر حاوی رہتا۔

بس وہ انسان کو دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے، برداشت نہیں کر سکتے تھے! شعر کہہ کر بھی دکھوں کا مداوا کرنے کی سعی کرتے تھے۔ شاعری سے کام نہیں چلتا نظر آتا تو اجنبی حاکم کے مظالم سے چھٹکارے کے لئے کبھی کانگریس کبھی مسلم لیگ کبھی کمیونزم میں پناہ گزیں ہوجاتے؛ یہ نہیں تو تصوف ہی سہی، کچھ کچھ تسکین تو وہاں بھی ہوجاتی تھی، فرنگی محل کے آستانہ پر بھی، متھرا کی شیام نگری میں بھی۔

ان کی غزلوں کو پڑھ کے لگتا ہے کہ ہر وہ شعر جو ہم نے پڑھا کلاسیکی غزل کا بھرپور نمائندہ ہے۔ غزل کے ساتھ '**کلاسیکی**' بہت سے معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ ایک معنی یہ بھی لے لیجئے کہ دل کی شاعری، ساری کی ساری، کلاسیکی شاعری ہے!

حسرت کا ایک مصرعہ ہے: ع تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی! **تماشا کامیاب**، کہ تغزل سے بھرپور خالص عشقیہ شاعری کا فن ہمارے عہد میں جس خوبصورتی سے حسرت نے برتا، ان کے معاصروں میں کسی کے یہاں نہیں ملے گا۔ اور **تمنا بے قرار** اس لئے کہ دل زدگی کی اتنی پیاری شاعری پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی، کچھ اور بھی! حسرت اچھے شاعر تھے اور ان کے بعض شعر اردو کے بڑے پیارے شعروں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا سارا سرمایہ نہیں۔ شاید ان کا سب سے بڑا ایسیٹ (ASSET) بھی نہیں۔ تاہم وہ خود اپنے آپ کو بطور شاعر ہی پیش کرتے رہے؛ اور شاعری ہی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے رہے۔ سو، ہم پر بھی واجب آیا کہ پہلے شاعر حسرت ہی کی بات کریں۔

ع رب

☆☆☆

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

بدر الدین طیب جی

آزادی کے بعد علی گڑھ کے چوتھے وائس چانسلر ۱۹۶۲-۱۹۶۵ء

از ڈاکٹر شائستہ خان

خودنوشت سوانح عمریاں کتنی دل آویز ہوتی ہیں، آپ سب پڑھنے والوں پر روشن ہے جو اہم سوانح عمریاں اردو میں ابھی نہیں آپائی ہیں مگر آنا چاہئیں ان میں بلاشبہ طیب جی کی خودنوشت ''ایک انانیت پسند کی یادیں'' اولیں ترجیحات میں آتی ہے۔ اُس کے ایک دلکش اقتباس کی پیش کش، امید ہے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ (ش)

علی گڑھ کو الوداع کہنے کا دن قریب تر آ گیا تھا۔ میں وائس چانسلروں کی خیر مقدمی اور وداعی کی تقریبوں کو پسند نہیں کرتا تھا جس میں علی گڑھ والے شاہانہ خرچ کرتے تھے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ لوگ وداعی تقریب کرتے، ہم دونوں (میں اور اہلیہ) نے اپنی طرف سے یہ تقریب کر ڈالی۔

اور کیا غضب کی جگہ کا انتخاب ہو گیا اس کے لئے! اتنی خوبصورت جگہ کو میری یاد میں پہلی بار اس استعمال میں لایا گیا تھا۔ یہ علی گڑھ فورٹ کے حسین میدان تھے۔ اور میں نے خیال کیا کہ یہاں تو کانووکیشن Convocation کرنا بھی کس قدر موزوں رہتا۔ اس کا مجھے اس دن خیال آیا جب یہ وداعی پارٹی وہاں منعقد ہوئی۔

علی گڑھ کو الوداع

اور اب ہم ٹرین سے علی گڑھ سے دلی جا رہے تھے، پورا اسٹیشن بھرا ہوا تھا، کمپارٹمینٹ تک پہنچنے کے لئے اس بھیڑ میں سے راستہ بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ مجھے الوداع کہنے کے لئے طلبا نے ساری ٹرین کو گھیر لیا، عجیب سماں تھا۔ کچھ طلبا مجھے دہلی تک چھوڑنے کے لئے آئے۔

(۲)

علی گڑھ کا وائس چانسلر ہونے سے پہلے، اپنے پیش رو کرنل زیدی کے زمانے میں مجھے وہاں کی مجلس عاملہ (Executive Council) کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ اور کونسل کی میٹنگ کے سلسلے میں میرا علی گڑھ جانا ہوتا رہتا تھا۔ یہ 1962 کی بات ہے۔ علی گڑھ کے قومی پریس میں کوئی پسندیدہ خبر کم ہی ہوتی تھی۔ کیوں کہ ابھی تقسیم ہند کے زخم کہیں بھی بھرے نہ تھے۔ اور ادھر علی گڑھ یونیورسٹی میں 70 فیصدی مسلمان اور 30 فی صدی غیر مسلم طلبا تھے اور یہ بات دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ کونسل کے اجلاس عام طور سے ڈیڑھ مہینے کی اوسط پر ہوتے تھے جن میں شرکت کر کے میں اسی دن کافی رات گئے تک دہلی واپس ہو جاتا۔ کرنل زیدی میرے قدیم دوستوں میں تھے۔ کونسل میں میرے ایک اور دوست صدیق حسن آئی سی ایس بھی میرے ساتھ ساتھ نامزد ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ میں علی گڑھ میں بس نواب چھتاری کو جانتا تھا یا پروفیسر محمد حبیب کو جن کی شادی میری ایک کزن سے ہوئی تھی۔ کونسل کے اجلاس میں کبھی کبھی دیر رات گئے تک چلتے اور ایک آدھ بار دوسرے دن تک بھی نوبت پہنچ جاتی۔ لوگ بڑی لمبی لمبی باتیں کرنے کے عادی تھے۔ وائس چانسلر اخلاق برتتے اور پوری توجہ سے ہر ایک کو سنتے۔ ان کی سماعت میں کافی فرق آ گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں یا تو اللہ ہی کونسل کی میٹنگوں کو ختم کرنے میں مدد کرتا یا لوگ خود ہی تھک ہار مان لیتے۔ کچھ ہی قبل چڑجی کمیٹی اور اس کی انکوائری (enquiry) رپورٹ آ چکی تھی اور کمیٹی نے جو سفارشات کی تھیں ان پر ہماری طرف سے عمل در آمد ہونا تھا۔ کرنل زیدی نے پوری کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ چڑجی کمیٹی کی سفارشات پر پوری طرح عمل در آمد ہو۔

کرنل زیدی کی معیاد (Term) ختم ہونے لگی تو ان کے جانشین کی تلاش شروع ہوئی۔ پرو وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف حسین، سوبورن (Soborn) کے پی ایچ ڈی، بہت نامی مورخ اور اردو ادب کے بڑے ممتاز اسکالر تھے۔ ان کا وائس چانسلر ہونا جانا ایک فطری چوائس (choice) تھا مگر مزاجاً وہ اس پوسٹ کے لئے موزوں نہ تھے۔ کرنل زیدی کی پی وی سی (P.V.C.) کے ساتھ بہت دور تک نبھ نہ پائی حالانکہ زیدی صاحب ان کے بھائی کے بڑے قریبی احباب میں تھے۔ University کیسے چلے اس پر ان کے خیالات کافی پرانے (Coservative)، قدامت پسند تھے۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں، سماج اور سیاست میں ہندوستان کو جس نئے Secular رجحان سے آشنا کیا تھا ان کے مسلم تعلیم کے بارے میں خیالات سے یہ سب میل نہیں کھاتا تھا۔

اس درمیان اِدھر اُدھر سے سن گن ملنے لگی کہ شاید میں علی گڑھ پہنچوں۔ وزیر اعظم نے ۷ر جولائی ۱۹۶۲ء کو پہلگام سے مجھے خط لکھا جس کے ساتھ وزیر تعلیم ڈاکٹر شری مالی کا خط بھی منسلک تھا۔ شری مالی نے پنڈت جی کو لکھا تھا کہ علی گڑھ کے بارے میں صدر اور نائب صدرِ جمہوریہ سے انہوں نے گفتگو کی ہے اور مجھے وہ علیگڑھ بھیجنے کے بارے میں متفق ہیں۔ وزیر اعظم نے شری مالی کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وزیر تعلیم نے مجھے کچھ مشکل میں ڈال دیا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی اہمیت کو میں پوری طرح سمجھتا ہوں جو یونیورسٹی سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تازہ نسلوں کا Intellectual Centre ہے۔ اور اس لحاظ سے آنے والے زمانے میں علی گڑھ کا غیر معمولی رول رہے گا۔ بہت سے لوگوں نے اس بارے میں مجھ سے بات کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ہیں اور یہ سب تمہارا نام وائس چانسلر شپ کے لئے پرزور سفارش (Strongly recommend) کر رہے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے تمہارا وہاں جانا اچھا ہی ہو گا۔ مگر دوسری طرف تمہارا وزارت خارجہ کو چھوڑنے کا بھی مجھے افسوس ہوگا۔ گو یہ بہت قلیل عرصے کے لئے ہی کیوں نہ ہو مگر کم سے کم ۳ر سال کا وقفہ تو ہوگا ہی۔ تاہم دونوں امور کو تولتا ہوں تو ان میں جھکاؤ اسی طرف ہے کہ تمہارے لئے علی گڑھ جانا بہتر ہی ہوگا بشرطے کہ تمہیں بھی اسی میں دلچسپی ہو۔ اور یقیناً میں اس بات سے روکوں گا نہیں''۔ یہ خط ملنے کے بعد میں نے بواپسی پنڈت جی کو فوراً ہی لکھا '' آپ کے دلی سے غیر حاضری مجھے ایک موقع مہیا کر رہی ہے کہ میں اس بارے میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ تحریر میں لے آؤں''۔

☆☆☆

(نیم علیگ) جوش ملیح آبادی کی یہ ترقی پسند نظم بھی کیا آپ کی یادداشت میں ہے؟

جوش ملیح آبادی پر سب رنگ گزرے ہیں، ایک رنگ یہ بھی رہا !

اس شعلہ وشبنم نظم کی یاددہانی کے لیے ہم محترم سیداخلاق حسین قاسمی صاحب مرحوم کے شکرگزار ہیں

بہت سے گزرے ہیں یوں تو انساں، خرد کی شمعیں جلانے والے
بتوں کی ہیبت اٹھا نے والے، خدا کا سکّہ بٹھانے والے
مگر عرب کے خموش افق سے کرن وہ پھوٹی رسول بن کر
کہ جتنے ظلمت کے خاروخس تھے دہک اٹھے سرخ پھول بن کر
ابھی تک انکار پر مصر ہے ، دماغ مختل ہے کافری کا
نظامِ قدرت سے ہے نمایاں ثبوت اس کی پیمبری کا
کوئی نظیر اس کی مل سکے گی ؟ کہ آگ پانی سے جل سکی ہے
زمین چھلکا سکی ہے تارے ؟ چٹان موتی اگل سکی ہے؟
کبھی کوئی جنس اپنی ضد کی طرف بتادو اگر پھری ہے ؟
کلی سے شعلے کبھی اڑے ہیں ؟ شرر سے شبنم کبھی گری ہے؟
بھلا یہ ممکن ہے کذب پر ہو مداراک دین مستقل کا ؟
گراں بہاوقت کی جبیں پرنشاں ہو اک پائے مضمحل کا؟
دروغ اور یہ فروغ پائے ، دلوں پہ حاصل ہو بادشاہی
اور اس کی حقانیت پہ صدیوں کروڑوں انسان دیں گواہی
یہ ہم نے مانا کہ جھوٹ کو بھی فروغ ہوتا ہے لیکن اتنا !
سبک شگو فوں سے چھیڑ کرتا، گذر گیا اک ہَوا کا جھونکا
مگر وہ ہستی جو آج لاکھوں خدا کے بندوں کو حرزِ جاں ہے
وہ محض اِک شعبدہ ہو ناداں ! بتا فراست تری کہاں ہے
بس اب دلائل کی روشنی میں ضرور یہ ماننا پڑے گا
کہ ہے پیامِ خدائے برتر ، پیام پیغمبرِ عرب کا
سنے ہوئے اس پیام حق کو اگر چہ صدیاں گذر چکی ہیں
بہت سی قومیں ابھر کے ڈوبیں، ہزاروں جی جی کے مَر چکی ہیں
مگر حروف اسکے ہیں کہ ابتک اسی طرح سے جھلک رہے ہیں
ہر ایک نقطے میں زندگی کے ہزاروں شعلے بھڑک رہے ہیں
کبھی تو کرغور اپنے جی میں کہ اس روش میں یہ بات کیوں ہے؟
اگر یہ شئے عین حق نہیں ہے تو پھر یہ رنگِ ثبات کیوں ہے؟
اگر یہ مصحف نہیں تو ہاتھوں پہ کیوں مشیت لیے ہوئے ہے؟
اگر غلط ہے تو کیا خدا کا جلال سازش کیے ہوئے ہے؟
عرب وہ ریگِ رواں کا عالم، سرا ب کی ہولناک دنیا
وہ سرخ ذرّات کا سمندر ، تپش کا وہ خوفناک صحرا
حدودِ امن و اماں سے باہر ، لباس شائستگی سے عاری
گرج سے افلاک زلزلے میں، کڑک سے لرزاں زمین ساری
یہ ملک اور اک یتیم بچہ، نہ کوئی وارث نہ کوئی والی
سرہانے ایک پیر سال خوردہ ، رسیدہ صدضعف و خستہ حالی
نہ باپ سر پہ ، نہ ماں کا سایہ ، بلانصیب وستم رسیدہ
مقام حیرت کا رہنے والا ، نہ شاد وفرحاں نہ آبدیدہ
کتاب سے نا بلد، معرّیٰ فیوض تعلیم و تربیت سے
کھلیں جو آنکھیں تو بند پائی ہر راہ ششں جہت سے
پَلا ہوبے بیکس یتیم بچہ عرب میں اور ایسی ابتری سے
اگر پیمبر نہیں تو واقف ہوا وہ کیونکر پیمبری سے؟
اگر صد ا اس نبی امیّ کی آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا ؟ جواب اس بات کا نہیں ہے
عرب کے ہیرو ، عجم کے سلطاں ، نظامِ ارض و سما کے والی
زمیں پہ لطف و کرم کی تونے عجب بنا ئے لطیف ڈالی
چلا جو دوشِ صبا پہ تیر اپیام ابرِ بہار بنکر
نظام باطل کے سنگریزے مہک اٹھے برگ و بار بنکر؟
مشیتِ ایزدی کے دل سے بنا ہے شاید دماغ تیرا
وگر نہ کیوں طاقِ بادِ صرصرَ میں جل رہا ہے چراغ تیرا
دبے ہیں سینے میں زندگی کے بہت سے جوہر ابھرنے والے
اِدھر بھی ہاں اک نظر خدا را! دلوں کے بیدار کرنے والے

☆☆☆

سر سید آج ہوتے تو

شاہین نظر

اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

"بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا؛
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"

ہم علی گڑھ والے اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں پلاؤ، بلکہ بریانی کھانے کے لئے کسی کے مرنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ بانی درسگاہ کی یوم پیدائش کو بہانہ بنا کر ہم ہر سال یہ موقعہ نکال لیتے ہیں۔ سرسید ڈے کے نام سے جاری یہ روایت اتنی مستحکم ہو چکی ہے کہ اس تقریب کا انعقاد نہ صرف علیگڑھ میں بلکہ ہندوستان کے تمام اہم شہروں میں اور دنیا کی تقریباً تمام قابل ذکر راجدھانیوں میں ہوتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سال کا یہ ایک موقعہ ہوتا ہے جب علی گڑھ کے فارغین چاہے جس عمر کے ہوں بچہ بن جاتے ہیں۔ ڈنر کا اہتمام ہو اس نام پر لڑتے جھگڑتے ہیں اور جب ڈنر سجایا جاتا ہے تو اکثر سبقت کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد میں کئی شہروں میں رہ چکا ہوں اور ہر جگہ اس روایت —یا علی گڑھ والوں کی زبان میں کہیں تو ٹریڈیشن— کی پاسداری دیکھی ہے۔ میں اس ٹریڈیشن پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں نہ ہی کسی کو اس کا حق دے رہا ہوں۔ ہماری بریانی ہم جیسے چاہے کھائیں... کوئی ہمیں بتائے کیوں!

اس جملۂ معترضہ سے الگ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ کی صورت میں سرسید نے ہمیں ایک بیش قیمتی سرمایہ دیا ہے جس کے لئے انھیں جس جس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا جائے کم ہے۔ مگر کیا ہی اچھا ہو کہ بریانی خوری کے ساتھ ساتھ ہم اس سالانہ دن کو اپنی آرزوؤں اور تمنناؤں کی تکمیل کا دن بھی بنا دیں۔ اپنے آپ کو آنے والے سال یا سالوں کے لئے کوئی پروگرام دیں۔

جس شہر میں بھی سرسید ڈے منایا جاتا ہے وہاں کچھ دنوں کے لئے ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر علیگ بھی اس کے بارے میں باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس کی تیاری پر ہم اپنا وقت اور پیسہ لگاتے ہیں۔ کسی اہم سماجی یا سیاسی شخصیت کو دعوت دے کر اسٹیج فراہم کرتے ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا ہے۔ ہم ڈنر کھاتے ہیں اور گھر جا کر سو جاتے ہیں۔ اور پھر پورے سال سوتے رہتے ہیں۔ اگلی بار پھر یہ سالانہ دن آ رہا ہے۔ ایک بار پھر سے یہ ساری کہانی دہرائی جائے گی۔

یہ رویہ مسلم سماج کے اس طبقے کا ہے جس نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اور آج بھی ناموافق حالات کے باوجود زندگی کے تمام اہم شعبوں میں اس کی نمائندگی موجود ہے۔ آج ملک میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ہے۔ مسلمان اُن میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بلکہ باہر کی یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی حیثیت باقی ہے۔ دوست ہو کہ دشمن ہر ایک اس کی طرف ضرور دیکھتا ہے۔

ہم علیگڑھ والوں کو اپنی اس پوزیشن کا فائدہ اٹھانا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں اپنی حالت کو مزید بہتر بنانے کے لئے۔ سیاست دانوں کو اپنے پروگرام میں بلانے اور ان سے رشتہ رکھنے میں کوئی برائی نہیں مگر ان کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانا اور انھیں فیس بک اور وہاٹس ایپ پر شئر کرنا ہماری معراج نہیں ہونی چاہیے۔

ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق ہی لائحۂ عمل طے کرنا ہوتا ہے اور اُنہیں لوگوں کو کرنا پڑتا ہے جو اُس زمانے میں جی رہے ہوتے ہیں۔ سرسید اور ان کے عہد کے لوگوں کو جو کرنا تھا وہ کر کے چلے گئے۔ اب ہمیں آج کے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ آج کا سب سے بڑا چیلنج اپنے اوپر چھا رہے مایوسی کے بادل کو چھانٹنا ہے اور اپنے لوگوں میں، خاص کر نئی نسل میں، عزم اور حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ اندنوں ملک کے حالات ذرا صبر آزما ہیں۔ مگر اس سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جمہوری نظام میں حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ جسے دوام حاصل ہے وہ ہے یہ ملک اور اس کے باشندے۔

سرسید کے مقابلے میں ہم ذرا بہتر حالت میں ہے۔ اُنھیں دو محاذوں پر جنگ لڑنی پڑی تھی۔ ایک طرف انگریز حکمرانوں کو یقین دلانا پڑا تھا کہ وہ کوئی حکومت مخالف کام نہیں کر رہے ہیں دوسری طرف اپنی قوم کو آمادہ کرنا پڑا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھروں سے باہر بھیجیں۔ دوسرے محاذ پر انھیں زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں اپنے لوگوں کی مخالفتیں سہنی پڑیں۔ ان پر انگریزوں کی چاپلوسی کا الزام لگا۔ ان کے خلاف کفر کا فتویٰ تک جاری ہوا۔

آج کے رہنما کو یہ سب جھیلنا نہیں پڑ رہا۔ عام انسان تعلیم کی اہمیت سے واقف ہو چکا ہے۔ بس اب اسے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی دور دراز کا سفر کر رہی ہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور ملازمت کرنے کے لئے۔ اس کے علاوہ ہمارا ملکی نظام بھی کچھ ایسا ہے کہ کوئی حکومت چاہے کتنی بھی مسلم دشمن کیوں نہ ہو ہم سے ہمارے بنیادی حقوق نہیں چھین سکتی۔

جدّہ میں مقیم حیدرآبادیوں کی شروع کی ہوئی تحریک سے ایک بڑا کام ہو گیا ہے۔ مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش گیارہ نومبر کو سرکار نے نیشنل ایجوکیشن ڈے یعنی قومی یوم تعلیم ڈکلئر کر دیا ہے۔ اس کام میں علیگڑھ کے بعض فارغین کی کوششیں بھی شامل رہیں۔ دو ہزار آٹھ سے ہر سال اس دن تعلیمی اداروں میں سیمینار، سمپوزیم، تقریری مقابلوں، اور ایجوکیشن ریلیوں وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔

اس دن کو ابھی تک ٹیچرس ڈے جیسی شہرت نہیں مل سکی ہے۔ اس کام میں وقت لگے گا۔ علیگڑھ کے لوگ اس دن کی معنویت کو بڑھانے کا کام کر سکتے ہیں۔ مولانا آزاد کے نام سے کوئی بڑا ایوارڈ شروع کیا جا سکتا ہے۔ ایجوکیشن ڈے کی مناسبت سے ہر سال ایک بڑا پروگرام کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد جہاں اپنے اکابرین کی خدمات کا اعتراف ہوگا وہیں دنیا کو یہ پیغام دینا بھی ہوگا کہ اس ملک کے مسلمان ایک متحرک قوم ہیں اور تعمیری سوچ رکھتے ہیں۔

دوسرا کام ادارہ سازی کا ہے۔ مسلمان اس میں باقی قوموں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں۔ علیگڑھ کے فارغین ملک کے مختلف گوشوں کے رہنے والے ہیں اور اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان مختلف جگہوں پر بسے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے اپنے علاقوں میں ایسے ادارے کھلوانے چاہییں جن کے ذریعہ سے تعلیمی اور رفاہی کام ہو سکے۔ خود نہیں کر سکتے ہوں تو جو لوگ مقامی طور پر کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے —صرف پیسوں سے مدد کرنا کافی نہیں ان کا حوصلہ بڑھاتے رہنا بھی ضروری ہے۔

آجکل کے مخصوص سیاسی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے حوصلے ذرا پست ہیں اور ان پر مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے۔ نوجوانوں پر اس کے منفی اثرات زیادہ پڑ رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک صورت حال ہے۔ اس سے باہر نکالنے کے لئے انہیں تعمیری کاموں میں لگانا ہوگا۔ ایسے پروگرام سوچنے ہوں گے جن سے ملازمت اور کاروبار کے مواقع پیدا ہو سکیں۔ جو کام سیاست دانوں کے ہیں وہ انھیں کرنے دیا جائے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ جتنے بھی مخلص کیوں نہ ہوں ان کی نظر قلیل مدّتی فائدوں پر ہوتی ہے۔ ہمیں ایسا پروگرام سوچنا ہوگا جس میں استقامت ہو، جس کے دوررس نتائج برآمد ہوتے ہوں۔ اور یہ کام صرف پڑھا لکھا طبقہ ہی کر سکتا ہے۔

مصنف پیشے سے صحافی ہیں اور ٹائمز آف انڈیا اور عرب نیوز سمیت تقریباً آدھے درجن اخبارات میں کام کر چکے ہیں۔ اندنوں انڈیا ٹوڈے میڈیا انسٹیٹیوٹ میں وزٹنگ فیکلٹی ہیں۔ اس سے پہلے شاردا یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صحافت پڑھاتے رہے ہیں۔)

***

سال کی بہترین تحریریں، آپ کے ملاحظہ میں لے آئیں

کس کی نظر لگ گئی اسے

از، ف س اعجاز، ماہنامہ انشاء، کلکتہ، مئی - جون 2022

کرناٹک کے اُڈِپی میں رام کے جنم دن پر مندر کے باہر جو رام نومی میلے لگائے جاتے ہیں اُن میں مسلمان تاجروں کو اسٹال لگانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔

مسلم تہواروں میں جو میلے لگائے جاتے ہیں اُن میں ہندو دکاندار ہمیشہ بلا روک ٹوک اپنا سامان بیچتے ہیں۔ ملک میں آپسی بھائی چارہ اور تجارت کو اسی طرح فروغ ملتا رہا ہے۔ اور یہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی قابل فخر پہچان ہے۔ نیا بنگالی ہندو سال شروع ہونے والا ہے اور حسب معمول کلکتہ میں اس وقت بیساکھی کے موقع پر نئے سال کے لاکھوں بنگالی کلینڈر تیار کیے جارہے ہیں۔ چھپائی کے بعد دیوی دیوتاؤں کی تصویروں والے کلینڈروں پر تاریخیں اور ٹِن لگانے کا زیادہ سے زیادہ کام مسلم کارخانہ دار کرتے ہیں۔ بنگال میں کاروبار میں کوئی رکاوٹ، کوئی بھید بھاؤ نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں کھانے پینے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو کچھ ہندوتوا کے پیروکار رہے ہیں وہ تقسیمِ ملک کے وقت کے ''ہندو پانی - مسلم پانی'' والے دنوں کی یاد دلانے کو کافی ہے۔ لیکن شکر ہے یہی حال سارے دیش کا نہیں ہے۔

ٹیلی گراف اخبار کے رپورٹر دیوراج نے آپسی محبت اور سیکولر روایت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے پٹنہ (بہار) سے ایک خبر دی ہے۔ اس بار ماہِ رمضان میں پڑنے والے رام نومی (رام کے جنم دے) کے لیے پہلے کی طرح ہی 62 سالہ محمد رشید گیا شہر کی مشہور گودام مارکیٹ میں اپنی سلائی کی مشین پر ہمیشہ کی طرح رام نومی کے رنگ برنگے، سیدھے سادے اور جھالر دار جھنڈے سینے میں مصروف ہے۔ اخبار میں چھپی نورانی شکل والے روزہ دار رشید کی سفید لکھنوی ٹوپی (جو ممکن ہے لکھنؤ کے کسی ہندو کاریگر نے تیار کی ہو) اور سفید کرتہ، پاجامہ سے اس کی سادگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی طرح گیا کے اس بازار میں اور بہت سے مسلم کاریگر سستے مہنگے، سادہ اور جھالر دار نفیس جھنڈے اپنے کارخانوں میں بناتے ہیں۔ اور ان جھنڈوں پر ''جے شری رام'' کڑھا ہوا ہے یا ہنومان کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔ مہاتما بدھ کی اس نگری میں مسلم کاریگروں کی یہ صنعت ایک سو سال پرانی ہے۔ یہ رام نومی جھنڈے یا ہنومان کی نسبت سے مہاویری جھنڈے کہلاتے ہیں جو یہاں سے پورے بہار اور جھارکھنڈ میں سپلائی کیے جاتے ہیں۔

مسلمان درزیوں کے بنائے یہ جھنڈے ہندو گھروں اور مندروں کے کلش پر لہرائے جاتے ہیں۔ اس میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق، کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ رشید پندرہ سال کی عمر سے اس کام میں ہے۔ اس کے باپ اور دادا بھی رام نومی کے جھنڈے اور مزاروں اور خانقاہوں کے جھنڈے بناتے تھے۔ اس کے ایک پڑوسی محمد ادریس کا بھی یہی مشغلہ ہے۔ یہاں بہت سارے کارخانے ہیں جو ہولی کے دوسرے دن سے رام نومی کے جھنڈے بناتے ہیں۔ دور دور سے انہیں خریدنے ہندو آڑھت دار آتے ہیں۔ گھریلو خریدار بھی اپنے من پسند جھنڈے بنواتے ہیں۔ ایک خریدار کویتا شرما کہتی ہیں کہ یہ جھنڈے پوجا کے ہوتے ہیں اور یہ کاریگر ان کی پوری عزت کرتے ہیں۔ اور بڑے قرینے اور احتیاط سے انہیں سمیٹ لپیٹ کے رکھتے ہیں۔ اگر یہ ہم ہندوؤں سے نفرت نہیں رکھتے تو میں ان سے نفرت کیوں کروں؟ یہ بیس سال سے ہمیں مطمئن کرتے آرہے ہیں۔ ہمارے پورے خاندان کے کپڑے، گھروں کے پردے، صوفے، کرسیوں کے غلاف ہماری تسلی کے سیتے ہیں۔ اس پر کیا تبصرہ کیا جائے سوائے اس کے کہ ''کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری''! کلکتہ کے کمہار ٹولی میں درگا پوجا اور کالی پوجا کے مورتی سازوں میں مسلم کاریگر بھی ہیں جن کے فن کی قدر کی جاتی ہے۔

بسنت میں رام نومی ہوتی ہے۔ بسنت میں پھول کھلنے چاہئیں نہ کہ کانٹے۔

☆☆☆

From: Alig Brotherhood علیگ عزیزوں کے خط

4 اپریل 2022

امید کرتا ہوں کہ آپ اور حلقہ احباب یاراں مع الخیر ہوں گے۔ آپ نے یہ جو ''علیگڑھ ڈایسپورا'' کے عنوان سے وسیع المناظر اور جاذب نگاہ بزم ترتیب دی ہے، یہ بہت خوب ہے۔ اگر یہ قصۂ پارینہ نہیں، تو یوں تو ہے کہ آپ کی اس پاکیزہ محفل کے توسط سے ماضی قریب کے بہت سے ادبی اور فکری پہلو آشکار ہو جاتے ہیں جن کا تعلق مادرِ درسگاہ علیگڑھ کے اُن نابغہ روزگار شخصیات، واقعات اور مشاہدات سے مربوط ہے۔ گویا تنگ رگوں میں ایک بار پھر لہو تر و تازہ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

بقول جوش ملیح آبادی صاحب: ''قطار در قطار منتظر الفاظ کو اظہارِ خیال و فکر کی سواریاں مل جاتی ہیں''۔ یوں فارسی کے اِس دلنشیں اور تاریخی جملے کی بھی تائید و توثیق ہو جاتی ہے کہ: ''رفتید وَلے نہ اَز دِل ما''۔ ساتویں اور آٹھویں شماروں میں پروفیسر حبیب صاحب، ہاشم صاحب، علیم صاحب، اعظمی صاحب، قیوم صاحب اور دیگر علیگی شخصیات کے بلند آہنگ افکار نظر سے گزرے۔۔ صحیح معنوں میں بڑا لطف آیا اور یکسر نئی جہتوں کو جاننے، سمجھنے، پرکھنے اور غور کرنے کا موقع فراہم ہوا۔

خطوط کے لئے علیحدہ صفحہ مختص کرنا ایک خوش آئند قدم ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری دنیا سے علیگی احباب اور اُن کے اہلِ خاندان اس پرچے کو خاصی دلچسپی اور دلجمعی سے پڑھتے ہیں۔ اِن دِنوں میرے والدِ محترم شاہ حسن عطا (علیگ) کی کئی تصانیف پایہ تکمیل کی جانب گامزن ہیں اور بہت جلد آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔

شاہ عمر عطا (واٹفورڈ۔ برطانیہ) مصور علی ڈپارٹمنٹ

Janab Bedar Saheb,

Whenever I get time to go through something refreshing and different from what has been attracting my attention, it is the collection of Aligarh Diaspora: a valuable collection of writings by different people related to the Academic and social life in the ambience of AMU.

I am sorry to respond to your excellent effort in bringing out these valuable information which are rarely found these days. May Allah give you health and longevity to enrch us in this unique style of yours. I still remember your dedication towards bringing out the four volumes of Hamid Nama in Jamia Hamdard.

With kind regards and Salam.

Sincerely

S. Ahmad

Former Vice Chancellor, Jamia Hamdard, N Delhi
508 BW Tower, Eros garden, Charmwood Village
Faridabad, Haryana

Aligarh Diaspora - 11
Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

Justice Mahmood – A Tribute

by **Mr. K.L. Misra**
Advocate-General, U.P.

My lord,

It was about the middle of the 19th century that Sir Syed Ahmed Khan, a person of broad and prophetic vision, like many others in India at that time, realised that the basic necessity for the advancement of this country was education. He gave his life to the starting of an institution which is today the Muslim University of Aligarh. It was a time when the introduction of separate electorates in India had not yet created a conflict between the Hindu and Muslim communities. I am only mentioning the father of Justice Mahmood because the wide sympathy and understanding of men, which Justice Mahmood had, appears to have been inherited from his father. Even what the father did would have been sufficient to confer immortality on any person. But Mahmood was to attain a greater immortality.

My Lord, during the early education of Justice Mahmood, I have tried to look into it, there is not visible that promise which is usually found in the early years of great and brilliant men. In fact, I have always felt that though Mahmood has shown to us an example to be followed ever afterwards, his studies, his academic career, his surroundings, none of these appears to furnish a clue to what he actually turned out to be when he became a Judge of this Court. His career is now well-known and does not need recounting. The moment he stepped into judicial service he started obtaining recognition. I do not think it has ever happened in the history of India that a mere Judge of the district court, because of his judgment having been noticed by the Privy Council, has immediately been considered eminently fit to be made a Judge of the High Court. And those were the days, My Lord, when an Indian could aspire to a very limited elevation in any service in India. All the posts at the top were occupied by foreigners. In this Province, as it was then, it was a great ambition for an Indian to become a Deputy Collector. Everything is thrown open to us now. It is impossible today to realise that the merit of Mahmood must have been so absolutely extraordinary that it made the Judges of the Privy Council, when they came across one of his judgments, as District Judge of Rae Barely, feel that they had come across a person whose talents were being wasted in the subordinate Judiciary.

Mahmood was then just about 32. In fact, his career as a permanent Judge in this Court started at the age of 36 and ended at the age of 44, and, in this short span of eight years, he has contributed to the legal literature of the world-judgments, scores and scores of them, when even one such judgment was sufficient to confer immortality upon any Judge anywhere in the world. It is impossible to explain how he was able to do it. The usual definition of 'genius' as a person having an infinite capacity for taking pains is impossible as an explanation for Mahmood.

His genius, I may still use that language, did not consist in an infinite capacity to take pains. It was the brilliance of a nightingale's song. It came naturally to him. It is impossible to explain how it all came. It is true that when he had gone to England, he had devoted himself to the study of things oriental; and it may be that in those days he imbibed the subtle principles of Hindu and Muslim laws, which enabled him, sitting afterwards in the High Court, to make pronouncements on those laws, which are even today a beacon light to us. You see in his judgments all the knowledge of the world and of literature of philosophy, of economics and of abstruse sciences, of languages and of the deep sources of law, not merely Indian but from almost every country of the world.

Mahmood sees with the eyes of an individual who is all knowing. It is always difficult for any person, occupying a judicial office, to keep aloof from active life, as he has to, and yet to know life, almost in its every aspect. This combination, the most difficult of combinations, was achieved in the case of Mahmood in a measure which, as I have said, is impossible to explain. It is

remarkable that, as a Judge of this Court, he found himself in minority in many cases. But some of his minority judgments, I can recollect at least two, were in advance of the time in which they were delivered. Later they were to become judgments of the majority. Some of those minority judgments show an amazing grasp of legal principles. Things which have become to us matters of every day life, almost like axioms in law, were then totally unknown. The concept of natural justice is today on the lips of everybody. Every petition that is presented by a dismissed employee at any level asserts a violation of natural justice. But it was impossible then to perceive the greatness of his judgment, in which Mahmood expounded that concept, or to realise then that the principles of natural justice, enunciated by him, would bear comparison with any judgment of the future, on those principles anywhere in the world.

My Lord, it was difficult to be fearless in those days. This country had completely forgotten its freedom. By the time Mahmood became a Judge, every part of our life was dominated and conditioned by British imperialism. Everything depended upon the will of the Rulers. And here was a person, suddenly and without precedent, raised from the post of a District Judge to the height of a Judge of the High Court. In sheer gratitude, there may be many persons even today, who would, in such a situation, almost unconsciously-, say: "I am suddenly in such a high place. I must conform to all the wishes of the Chief Justice. I must conform myself to the wishes of the Rulers. Having obtained such a position, I must see that it remains with me." But in Mahmood's judgments, his minority judgments, there is an approach of fearlessness, not advertised fearlessness but real fearlessness. That again is amazing. This man knew that the only footprints that remain on the sands of time, the only footprints that are worth leaving, are the footprints that are formed and grow out of a man's competence and character. All outward embellishments, all that we consider most valuable, the trappings of office, the paraphernalia that surrounds it, the pomp and show that become an accompaniment of status, are grounded in the weakness of human nature. No man of vision attaches importance to them. Mahmood, when he found himself in a position of conflict was prepared to throw aside everything that he had received. He was the first Indian Judge of this Court, and he showed not merely an amazing grasp of law, not merely a vast comprehendsion of human nature, not merely a wide field of vision that embraced almost the whole world in its ken, but a fearlessness that could be an example and has remained an example ever since that time.

My Lord, the Allahabad High Court, its greatness and its traditions have been spoken of by many of us. Everyone has spoken of its great Judges and its great Advocates. We are celebrating the completion of 100 years of the life of this Court. Many of the things we have inherited have descended visibly upon us from the past, as this robe, presented by the leader of the Russian delegation today, has descended upon the Chief Justice from his ancestors after a lapse of 200 years. One of the things which must, invisibly, be present today with us is the glory that Mahmood was able to contribute to this Court. If there is anything in the existence of a life hereafter, if it is possible for men, who have gone away in the past, to come back with their invisible presence, if it is possible for the Judges of this Court, who have passed into the eternal life to visit us again, and if it is possible that they are here today, they would all be saying: "Yes, Yes, we are great; but look at the person who. is leading us all. It is our leader Mahmood, who has contributed to the glory of this Court more than anyone else".

My Lord, the greatness of this Court, the glories of this Court are, in a large measure, due to Mahmood. If I were to make a selection today, if there was any kind of comparison of the Judiciary of this High Court, the Judges of this Court with the Judges of other great courts in the world, and if I had to select a delegate who would represent this High Court, nay the Courts of our country, in an international assemblage of Judges, past and present, I would unhesitatingly choose Mahmood.

My Lord, it is the portrait of that person, we are, respectfully, asking Your Lordship to unveil today. You will excuse my saying so, that Mahmood was such a great Judge – and even shorn of the fact that he was a Judge of this Court, such a great man – that by unveiling his portrait today you will continue to be remembered for years to come, and we shall continue to remember the association of your name with his great name.

My Lord, we are deeply grateful to you, but it is also with the sincerest feelings of gratitude to Providence that it gave us a personality as towering as of Mahmood, that I now request Your Lordship to unveil his portrait.

(Speech Delivered on November 27, 1966, on the occasion of the unveiling ceremony of the Portrait of Justice Mahmood, Celebrating the Allahabad High Court Centenary, 1866-1966)

***